دور تابعین میں اجتماعی اجتہاد: ایک تاریخی مطالعہ

Historical Study of collective Ijtihād in the era of Tabieen.

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر*

ABSTRACT:

There are two types of Ijtihād: individual and collective. When an individual Muslim Jurist perform Ijtihād it is called individual Ijtihād and when a Council of Islamic Jurists or qualified scholars undertake utmost effort to discover the Sharia ruling then it is called collective Ijtihād. In this research article a brief view of collective Ijtihād in past especially in the period of Tābiʿīn has been presented. The upshot of this research work is that the collective Ijtihād is very prominent in the first half of first Islamic century i.e., the time Prophet PBUH and the four right-guided caliphs. While in the second half of it and immediately after it, the practice of collective Ijtihād gradually declined and individual Ijtihād became the only type of Ijtihād. In the present time, it is necessary to reestablish the practice of our Prophet Muhammad BPUH and his immediate successors.

Keywords: Ijtihād, Collective Ijtihād, Tābiʿīn, Theory of Ijtihād, Ijtihād and Tābiʿīn

خلافت راشدہ ہی کے دوران فقہائے صحابہ بڑے بڑے اسلامی شہروں میں پھیل گئے اور انہوں نے وہاں علمی مجالس اور تعلیمی حلقے قائم کیے۔ ان صحابہ کرام سے استفادہ کرنے والے تابعین Σ کی تعداد بہت زیادہ تھی اور انہی تابعین نے صحابہ کرام کی وفات کے بعد ان شہروں میں افتاء وتدریس کی مسند کو سنبھالا۔ ذیل میں ہم اس دور کے معروف اسلامی شہروں کے مفتی وفقہائے صحابہ Ψ و تابعین Σ کا ایک اجمالی تعارف نقل کر رہے ہیں:

عہد تابعین میں فقہائے مدینہ

مدینہ میں جو فقہاء صحابہ افتاء واجتہاد کے میدان میں معروف تھے، ان میں حضرت عائشہ، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت أبو ہریرہ نمایاں تھے۔ ان صحابہ کرام کے علمی حلقوں سے پیاس بجھانے والے تابعین Σ کی جماعت بہت بڑی ہے۔ تاریخ فقہ اسلامی کی کتابوں میں ان صحابہ کرام کے نام گنوائے ہیں جو سلطنت اسلامیہ کے بڑوں شہروں میں مسند افتاء پر فائز ہوئے۔ ڈاکٹر تاج عبد الرحمن عروسی صاحب لکھتے ہیں:

"وقد تخرج على أيدي هؤلاء عدد من التابعين وعلى رأسهم سعيد بن المسيب المخزومي رحمه الله أحد الفقهاء السبعة الذين نشروا الفقه والفتوى والعلم والحديث وكان من أعبر الناس للرؤيا وأعلمهم بأنساب وكان يفتي والصحابة

---

*Assistant Professor, Humanities Department ،Sharia Advisor, Center of Islamic Finance ، COMSATS University Islamabad ،Lahore Campus, Lahore

متوافرون. توفي رحمه الله سنة 93 ه. وعروة بن زبير رحمه الله وأبو بكر بن عبد الرحمن المخزومي رحمه الله وخارج بن زيد بن ثابت والقاسم بن محمد بن أبي بكر وسليمان بن يسار وعبيد الله بن عبد الله بن عتبة بن مسعود وعلى بن الحسين بن على المعروف بزين العابدين وسالم بن عبد الله بن عمر ونافع مولى ابن عمر وأبان بن عثمان وأبو سلمة بن عبد الرحمن بن عوف وجاءت بعد هذه الطبقة طبقة أخرى منها: أبو بكر محمد بن عمرو بن حزم وعبد الله بن عثمان بن عفان وابنا محمد بن الحنفية ومحمد بن مسلم بن شهاب الزهري وجعفر بن محمد بن على بن الحسين المعروف بالباقر وربيعة المعروف بربيعة الرأي وانتهت رياسة هذه المدرسة إلى الامام مالك رحمه الله."[1]

"ان صحابہ کرام سے تابعین کی ایک بڑی تعداد نے علم حاصل کیا کہ جن میں سعید بن مسیب α سب سے نمایاں ہیں اور اُن فقہائے سبعہ میں سے ہیں کہ جنہوں نے فقہ، فتوی، علم اور حدیث کے میدان میں اہم خدمات سر انجام دیں۔ یہ لوگوں میں سب سے زیادہ خوابوں کی تعبیر اور انساب کا علم رکھنے والے تھے۔ انہوں نے صحابہ کرام کے زمانے میں ہی فتوی دینا شروع کر دیا تھا۔ ان کی وفات 93ھ میں ہوئی۔ اسی طرح عروہ بن زبیر، اَبو بکر بن عبد الرحمن مخزومی، خارجہ بن زید بن ثابت، قاسم بن محمد بن اَبی بکر، سلیمان بن یسار، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود، علی بن حسین بن علی زین العابدین، سالم بن عبد اللہ بن عمر، نافع مولی ابن عمر، ابان بن عثمان اور اَبو سلمہ بن عبد الرحمن بن عوف ∑ بھی ان معروف تابعین میں سے ہیں جنہیں مذکورہ بالا صحابہ کرام سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ اس طبقہ فقہاء کے بعد ایک اور طبقہ آیا، جن میں سے اَبو بکر محمد بن عمرو بن حزم، عبد اللہ بن عثمان بن عفان، محمد بن حنفیہ کے دونوں بیٹے، محمد بن مسلم بن شہاب زہری، جعفر بن محمد بن علی بن حسین الباقر اور ربیعہ رائی ∑ نمایاں ہیں۔ اس شہر کے علماء وفقہاء کی قیادت بالآخر امام مالک کو منتقل ہو گئی۔"

عہد تابعین میں فقہائے مکہ

مکہ میں موجود فقہاء صحابہ کرام میں نمایاں ترین حضرت عبد اللہ بن عباس تھے۔ جن کے بارے اللہ کے رسول نے یہ دعا فرمائی تھی کہ اللہ تعالی ان کو قرآن کی تفسیر و تاویل کا علم عطا فرمائے۔ ابن عباس τ سے علم تفسیر وفقہ سیکھنے والے معروف فقہائے تابعین درج ذیل تھے:

"وقد اشتهر من تلامذه: عطاء بن أبي رباح المتوفى سنة 105 ه وعبد الله بن عبيد بن أبي مليكة المتوفى سنة 117ه وعمرو بن دينار المتوفى سنة 126ه وعكرمة مولى ابن عباس المتوفى سنة 105ه ومجاهد بن جبير المتوفى سنة 103ه."[2]

"حضرت عبد اللہ بن عباس τ کے مشہور تلامذہ میں عطا بن اَبی رباح (متوفی ۱۰۵ھ) اور عبد اللہ بن عبید بن اَبی ملیکہ (متوفی ۱۱۷ھ) اور عمرو بن دینار (متوفی ۱۲۶ھ) اور عکرمہ مولی ابن عباس (متوفی ۱۰۵ھ) اور مجاہد بن جبیر (متوفی ۱۰۳ھ) ∑ شامل ہیں۔"

عہد تابعین میں فقہائے کوفہ

حرمین سے نکلنے والے صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت نے کوفہ میں بھی سکونت اختیار کی۔ ان ہجرت کرنے والوں میں حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت اَبو موسی اَشعری، حضرت سعد بن اَبی وقاص، حضرت عمار بن یاسر، حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت اَنس بن مالک وغیرہ جیسے نمایاں صحابہ کرام ہیں۔ حضرت عثمان τ نے بھی اپنے دور خلافت میں جب مختلف صحابہ کرام کو متفرق اسلامی شہروں کی طرف بھیجا تو اس

ہجرت کے مرحلے میں بہت سے صحابہ کرام کوفہ بھی منتقل ہوئے۔ مؤرخین کے ایک قول کے مطابق حضرت عثمان τ کے سانحہ شہادت تک تقریباً تین صد صحابہ کوفہ منتقل ہو چکے تھے۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد جب حضرت علی خلیفہ مقرر ہوئے تو انہوں نے کوفہ کو اپنا دار الخلافہ بنایا۔ جس وجہ سے یہ شہر صحابہ کرام کی پہلے کی نسبت اور زیادہ توجہ کا مرکز بنا۔ علاوہ ازیں حضرت عبد اللہ بن مسعود τ کو حضرت عمر τ نے اپنے زمانہ خلافت میں کوفہ کے لیے ایک معلم خصوصی کے طور پر بھیجا تھا۔ حضرت ابن مسعود کے مکتب فکر سے مستفید ہونے والے فقہاء و علماء کے بارے ڈاکٹر تاج عبد الرحمن عروسی صاحب لکھتے ہیں:

"من أشهرهم: علقمة بن قيس النخعي والأسود بن يزيد النخعي وأبو ميسرة عمرو بن شراحيل الهمداني ومسروق بن الأجدع الهمداني وشريح بن حارث الكندي ثم جاءت الطبقة الثانية بعد هؤلاء أمثال حماد بن أبي سليمان ومنصور بن المعتمر السلمي والمغيرة بن مقسم الضبي وسليمان بن مهران الأعمش وسعيد بن جبير وانتهت رياسة هذه المدرسة إلى ابن أبي ليلة وابن شرمة وشريك القاضي وأبي حنيفة رحمهم الله جميعا."[3]

"اس مکتب فکر کے معروف فقہاء میں علقمہ بن قیس نخعی، اسود بن یزید نخعی، ابو میسرۃ عمرو بن شراحیل ہمدانی، مسروق بن اجدع ہمدانی اور شریح بن حارث کندی شامل ہیں۔ ان فقہاء کے بعد دوسرا طبقہ آیا جن میں حماد بن ابی سلیمان، منصور بن معتمر سلمی، مغیرہ بن مقسم الضبی اور سلیمان بن مہران الاعمش اور سعید بن جبیر نمایاں ہیں، یہاں تک کہ اس مدرسہ فکر کی انتہاء ابن ابی لیلی، ابن شبرمہ، شریک القاضی اور امام ابو حنیفہ پر ہوئی۔"

عہد تابعین میں فقہائے بصرہ

بصرہ میں خادم رسول حضرت انس بن مالک نے تعلیم و تعلم کا سلسلہ شروع کیا۔ تابعین کے طبقہ میں ان سے مستفید ہونے والے علماء درج ذیل تھے:"وتخرج على عدد من علماء التابعين المعروفين في البصرة وعلى رأسهم الحسن البصري ومحمد بن سيرين مولى أنس بن مالك وكعب بن الأسود وأبو الشعثاء جابر بن زيد والحسن بن أبي الحسين مولى زيد بن ثابت."[4]"بصرہ میں حضرت انس سے مستفید ہونے والے معروف تابعین کئی ایک تھے۔ جن میں سب سے نمایاں حسن بصری، محمد بن سیرین مولی انس بن مالک، کعب بن اسود، ابو شعثاء جابر بن زید اور حسن بن ابی حسین مولی زید بن ثابت ہیں۔"

عہد تابعین میں فقہائے شام

حضرت عمر τ نے اپنے زمانہ خلافت میں حضرت عبد الرحمن بن غنم اشعری، حضرت معاذ بن جبل، حضرت عبادۃ بن صامت اور حضرت ابو درداء کو شام کی طرف بھیجا۔ ان صحابہ کرام ψ سے علم اخذ کرنے والے فقہاء و تابعین درج ذیل تھے:"وتخرج على أيديهم جميعا كثيرا من التابعين كأبي إدريس الخولاني ومكحول بن أبي مسلم الدمشقي ورجاء بن حيوة وعمر بن عبد العزيز."[5]"ان صحابہ کرام سے مستفید ہونے والی تابعین کی جماعت میں ابو ادریس الخولانی، مکحول بن ابی مسلم دمشقی، رجاء بن حیوۃ اور عمر بن عبد العزیز ہیں۔"

عہد تابعین میں فقہائے مصر

مصر میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص τ نے علمی تحریک کا آغاز کیا۔ مصر میں سکونت اختیار کرنے والے صحابہ کرام ψ میں سے یہ حدیث کے سب سے بڑے عالم تھے۔ ان سے استفادہ کرنے والے علماء بہت سے تھے۔ ان کی وفات کے بعد مصر میں ایک فقیہ کے طور پر جو معروف ہوئے، وہ یزید بن اَبی حبیب تھے جو امام لیث بن سعد کے استاد ہیں۔ اُستاذ محمد علی السایس لکھتے ہیں:

"واشتهر في مصر: يزيد بن حبيب مولى الأزد كان مفتي أهل مصر وعنه أخذ الليث بن سعد."[6] "مصر میں تابعین کی جماعت میں سے یزید بن حبیب α بطور فقیہ مشہور ہوئے، یہ اہل مصر کے مفتی تھے اور ان سے لیث بن سعد نے استفادہ کیا۔"

دور تابعین Σ میں اجتماعی اجتہاد کی فکر

اس دور میں اجتماعی اجتہاد کی فکر و منہج کو کئی ایک وجوہات سے کافی نقصان پہنچا کہ جن میں سے اَصحاب علم وفضل کا متفرق اسلامی شہروں میں پھیل جانا، بدعتی فرقوں کی طرف سے اجماع کی اہمیت کا انکار کر دینا اور اہل الحدیث اور اہل الرائے کے مابین فقہی اختلافات کا ظہور اہم ہیں۔

1) صحابہ کرام کا مختلف شہروں کی طرف ہجرت کرنا

خلافت راشدہ کے شروع کے ادوار میں فقہائے صحابہ تقریباً مدینہ ہی میں رہائش پذیر تھے۔ حضرت عمر تو اپنے زمانے میں صحابہ کرام کو دار الخلافہ یعنی مدینہ منورہ چھوڑ کر دوسرے شہروں میں سکونت اختیار کرنے سے جبراً روکتے بھی تھے۔ حضرت عثمان اور حضرت علی کے زمانے میں صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد نے دوسرے شہروں کی طرف ہجرت کی اور وہاں مختلف علمی مکاتب فکر کی بنیاد رکھی۔ استاذ محمد علی السایس لکھتے ہیں:

"قد علمت أن عمر كان يحرم على كبار الصحابة أن يبرحوا المدينة لا لحاجة ماسة وأنه كان بعيد النظر في ذلك لتيسر الجماء وبه قضى على كثير مما اختلفوا فيه فلما كان زمن عثمان وزادت الفتوح توسعا رخص لهم في الانتشار وسكنى الأقطار المفتوحة فتفرقوا بالأمصار واستوطنوها معلمين وقارئين وحراسا ومرابطين وكانت الأمصار متعطشة لمعونة تعاليم الدين الإسلامي فأقبل أهل كل قطر على ما نزل به من الصحابة يستفتونهم ويروون عنهم ويعلمون عنهم ومن الثابت أن الصحابة لم يكونوا فيما يعلمون سواء وليس كل ما حفظه أحدهم يحفظه الآخر وأن الأمصار تختلف في عاداتها وأنواع معيشتها وأحوالها الاجتماعية والاقتصادية وأنه كان من المتعذر على علماء الأمصار أن يتصلوا اتصالا علميا وثيقا لبعد المشقة وصعوبة المواصلات وكان من نتيجة ذلك أن تشبث أهل كل قطر بفتاوى علمائهم وأحاديثهم وعولوا على ما جرى عليه عملهم وحكم به قضاتهم لأنهم شاهدوا أحوالهم وخبروا أسبرتهم ووثقوا بهم فكان للمصريين فتاو وللشاميين."[7]

"جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا کہ حضرت عمر τ کبار صحابہ کرام کو بغیر کسی اَشد ضرورت کے مدینہ سے دوسرے شہروں میں منتقل ہونے سے روکتے تھے۔ وہ اس مسئلے میں گہری نگاہ رکھتے تھے کیونکہ اس سے اتفاق بھی میسر آتا تھا اور جب صحابہ کا آپس میں اختلاف ہوتا تو حضرت عمر τ ان میں سے اکثر کی اتفاقی رائے کے مطابق فیصلہ کرتے۔ لیکن جب حضرت عثمان کا زمانہ آیا اور فتوحات اسلامیہ سے اسلامی سلطنت کا دائرہ وسیع ہو گیا تو حضرت عثمان τ نے صحابہ کرام کو دوسرے شہروں میں منتقل ہونے اور مفتوح علاقوں میں رہائش رکھنے کی اجازت دے دی۔ پس مدینہ میں

مقیم صحابہ مختلف شہروں میں پھیل گئے اور انہوں نے اُستاذ اور قاری اور اسلامی سرحدوں کے محافظین اور پہریداروں کے طور پر بلاد اسلامیہ کو اپنا ٹھکانا بنایا۔ ہر شہر کے لوگ اسلامی تعلیمات کے حصول کے لیے پیاسے تھے۔ پس ہر شہر کے لوگ ان مہمان صحابہ کرام سے فتاوی طلب کرتے، ان سے روایت کرتے اور ان سے علم حاصل کرتے۔ یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ تمام صحابہ کرام کا معیار علم ایک جیسانہ تھا اور ایسا بھی نہ تھا کہ ایک صحابی کے پاس دین کا جو علم محفوظ تھا، دوسرے کو بھی وہ سب کچھ یاد ہو۔ اسی طرح مختلف شہروں کے رسوم ورواج، انواع معیشت، معاشرتی واقتصادی حالات ایک جیسے نہ تھے۔ ان وسیع وعریض شہروں کے علماء کے لیے انتہائی مشکل تھا کہ سخت مشقت اور ذرائع نقل وحمل کی تنگی کے باعث وہ باہمی علمی مجالس کا انعقاد کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر شہر میں اس شہر کے علماء کے فتاوی اور احادیث پھیل گئیں اور اس شہر کی عوام نے ان علماء کے عمل پر اعتماد کیا اور ان علماء کے فتاوی کے مطابق ان شہروں کے قاضیوں نے فیصلے کیے۔ علاوہ ازیں یہ لوگ ان علماء کے حالات کے عینی شاہد تھے اور انہوں نے ان علماء کی حقیقت اَحوال کی خبر دی اور انہوں نے ان کے علم پر اعتماد کیا۔ پس اسی وجہ سے مصری فقہاء کے فتاوی اور تھے اور شامی علماء کے فتاوی اور تھے۔"

کبار صحابہ کرام کے اس انتشار کی وجہ سے خلافت راشدہ میں قائم ہونے والے اجتماعی اجتہاد کے ادارے کی کارکردگی پر منفی اثرات پڑے۔ دوسرے الفاظ میں فقہاء صحابہ کرام کے بکھر جانے سے یہ ادارہ بھی کسی حد تک بکھر کر رہ گیا تھا۔

2) خوارج اور اہل تشیع کا اجماع سے انکار کرنا

تابعین عظام کے دور میں اجتماعی اجتہاد کے تصور کو سمجھنے کے لیے ہم اس وقت کے سیاسی فرقوں کا مختصر تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔ اس دور تک مسلمان امت تقریباً تین حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی؛ اہل سنت، اہل تشیع اور خوارج۔ خوارج اور اہل تشیع کے گروہ حضرت علی ؓ کے دور ہی سے شروع ہو گیے تھے۔ خوارج در حقیقت وہ بلوائی تھے جنہوں نے حضرت عثمان ؓ پر اپنے اَقرباء کو نوازنے کے الزامات عائد کئے اور بالآخر ان کو ان کے گھر ہی میں شہید کر دیا۔ بعد ازاں یہ گروہ تھوڑے عرصے کے لیے حضرت علی ؓ کے لشکر میں بھی شامل ہوا۔ بعد میں حضرت علی ؓ سے بھی علیحدہ ہو کر انہوں نے ایک نئے فرقے کی بنیاد رکھی۔ دوسری طرف حضرت علی ؓ سے محبت میں غلو کی بنا پر شیعانِ علی کا گروہ وجود میں آیا۔ یہ دونوں گروہ متعدد قسم کے متعصبانہ افکار اور شدت پسندانہ رویوں کے حامل تھے۔ ان دونوں گروہوں نے اجماع کا بھی انکار کیا۔

انکارِ اجماع کے اس رویے نے اجتماعی اجتہاد کے فکر پر بڑا گہرا منفی اثر ڈالا۔ ڈاکٹر تاج عبد الرحمن عروسی صاحب لکھتے ہیں کہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں اجماع احکام شرعیہ کی ایک کثیر تعداد کے لیے بنیادی مصدر کی حیثیت رکھتا تھا جبکہ تابعین کے دور میں صحابہ کرام کے مختلف شہروں میں انتشار اور حضرت علی و معاویہ کے مابین نزاعات کہ جنہوں نے مسلمانوں کو ان گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا کہ جن کی طرف اشارہ گزر چکا ہے، کے ظہور کی وجہ سے اجماع کا حصول مشکل ہو گیا تھا۔ اس تقسیم کے اسلامی فقہ پر بہت گہرے اثرات رونما ہوئے جیسا کہ اہل تشیع اجماع اور قیاس کو حجت نہیں سمجھتے تھے کیونکہ اجماع تو ان کے ہاں شیعہ و غیر شیعہ یعنی جمیع مجتہدین کے اتفاق کا نام ہے جبکہ دوسری طرف وہ غیر شیعہ فقہاء کی آراء وافکار کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔[8]

اُستاذ علی السایس اس دور میں اہل تشیع کے انکار اجماع کے فکر کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اہل تشیع اجماع کو اصول شریعت میں

سے ایک اصل کے طور پر قبول نہیں کرتے اور اسی طرح وہ قیاس کا بھی انکار کرتے ہیں۔ جہاں تک اجماع کا معاملہ ہے تو اس کا انکار انہوں نے اس لیے کیا ہے کہ اگر وہ اس کو ایک مستقل ماخذ کے طور پر مان لیں تو انہیں غیر شیعہ علماء کے علاوہ صحابہ کرام اور تابعین عظام اور ان علماء کی آراء کو بھی ماننا پڑے گا جن کو وہ دین میں ذرا بھی حیثیت نہیں دیتے۔[9] پس اہل تشیع میں اجتماعی اجتہاد کا اگر کوئی تصور باقی رہا بھی تو وہ صرف ان کے ہم مذہب و ہم مسلک علماء کا اجتماعی اجتہاد تھا نہ کہ امت کے علماء کا۔ جبکہ دوسری طرف اہل تشیع کے علماء، اہل سنت کی اجتہادی آراء کو اس لیے کوئی حیثیت نہیں دیتے کہ ان کو اہل سنت سے چند بنیادی اختلافات تھے۔ڈاکٹر تاج عروسی صاحب ان اختلافات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کلمہ "شیعہ" کا اطلاق مسلمانوں کی ایک جماعت پر ہوتا ہے جنہوں نے آل بیت کی محبت میں ایک فرقہ کی بنیاد رکھی۔ یہ حضرت علیτ اور آل بیت کے علاوہ کسی کی بھی خلافت کے قائل نہیں ہیں... پس اہل تشیع نے (خلفائے ثلاثہ کی طرح) اُموی خلفاء کی خلافت کا بھی اعتراف نہ کیا اور ان کے خلاف خروج کو جائز قرار دیا ہے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حضرت علیτ، اللہ کے رسولε کے بعد مخلوق میں سب سے افضل ہیں اور جنت میں ان کا مقام باقی تمام صحابہ کرام سے عالی ہے۔ ان کے ہاں حضرت علی τ کی خصوصیات اور امتیازات بہت زیادہ ہیں اور وہ معصوم ہیں۔ اسی طرح حضرت علی کے بعد آنے والے (گیارہ اَئمہ) بھی معصوم ہیں۔[10]

اہل تشیع کی طرح خوارج نے بھی اجماع کا انکار کیا۔ڈاکٹر تاج عروسی صاحب لکھتے ہیں کہ ان کے اہم افکار میں قیاس کا انکار اور اس کو ایک شرعی حجت تسلیم نہ کرنا ہے۔ انہوں نے تحکیم کے مسئلے میں حضرت علیτ پر کفر کا فتوی عائد کیا اور اسی طرح یہ لوگ حضرت معاویہ، حضرت اَبو موسی اَشعری اور عمرو بن العاص پر بھی تحکیم کے مسئلے میں شریک ہونے کی وجہ سے کفر کا فتوی لگاتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ امام وقت کے خلاف ہر حال میں خروج کو واجب سمجھتے ہیں، چاہے ان کے پاس اس کی قدرت ہو کہ وہ امام کی کجی کو درست کر سکیں یا ان کو اس پر قدرت نہ ہو۔ یہ اَصحاب جمل حضرت، زبیر اور عائشہ پر بھی طعن کرتے ہیں... ان کی رائے یہ بھی ہے کہ جو شخص اَوامر دین پر عمل نہ کرے یا گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو تو وہ کافر ہو جاتا ہے... یہ شادی شدہ زانی کے لیے حد رجم کے بھی قائل نہیں ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ رجم قرآن میں نہیں ہے... یہ قیاس کی طرح اجماع کو بھی شرعی حجت تسلیم نہیں کرتے بلکہ اجماع کو ایک ایسی جماعت کی رائے کا درجہ دیتے ہیں جس کی علمی حیثیت کے یہ معترف نہیں ہیں۔[11]

3) اہل الحدیث اور اہل الرائے کے مابین شدید اختلافات کا ظہور

صحابہ کرام کے دور میں قرآن و سنت بنیادی مصادر شمار ہوتے تھے۔ اگر کوئی مسئلہ قرآن و سنت میں واضح نہ ہوتا تھا تو وہ اجتماعی مشاورت سے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتے تھے جو بعض اوقات اجماع سکوتی کے درجے کو بھی پہنچ جاتا تھا۔ اور اگر بعض حالات میں اجتماعی مشاورت کا ماحول یا ذرائع موجود نہ ہوتے تو پھر بعض صحابہ کرام انفرادی اجتہاد کے منہج کو اختیار کرتے اور بعض توقف کے رویے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس اختلاف کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ فقہائے صحابہ کرام مختلف مزاجوں کے حامل تھے۔ صحابہ کرام کے یہی مختلف فقہی مزاج ان کے شاگرد تابعین∑ میں بھی نفوذ پذیر ہو گئے تھے۔ استاذ محمد علی السایس لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام کے زمانے میں اجتہاد، پیش آمدہ مسائل سے متعلق حکم شرعی کو کتاب اللہ میں اور پھر سنت رسول میں تلاش کرنے اور اگر ان دونوں میں بھی نہ ملے تو قرآن و سنت پر مبنی رائے پر عمل کرنے کا نام تھا۔ اس زمانے میں اہل علم مختلف مناہج پر عمل پیرا تھے۔ ان میں سے بعض ایسے تھے جو اجتہاد و رائے کے اظہار میں وسعت سے کام لیتے،

مصالح کو جانچتے اور حکم کی بنیاد ان مصالح پر رکھتے تھے جیسا کہ حضرت عمر اور حضرت عبد اللہ بن مسعود ہیں۔ جبکہ ان صحابہ کرام میں سے بعض ایسے بھی تھے جنہیں ان کی شدتِ احتیاط نصوص پر توقف کرنے اور صرف آثار ہی کے تمسک پر ابھارتی تھی جیسا کہ حضرت عباس، حضرت زبیر، حضرت عبد اللہ بن عمر بن خطاب اور عبد اللہ بن عمرو بن العاص تھے۔ پس جب صحابہ کرام ψ مختلف شہروں میں قاضی، مفتی اور معلم کے طور پر پھیل گئے تو ان شہروں کے حاملینِ علم تابعین و تبع تابعین نے تحقیق و استنباط میں ان صحابہ کے علم اور مناہج کو بطور ورثہ حاصل کیا۔"[12]

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد نئے پیش آمدہ مسائل کے حل کے یہ دو مناہج دو مستقل مکاتب فکر کی صورت میں سامنے آئے۔ جس میں سے ایک کا نام اہل الحدیث تھا اور دوسرے اہل الرائے کہلاتے تھے۔ استاذ محمد علی السایس اہل الحدیث کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس دور کے علماء میں ایک طبقہ ان فقہاء کا تھا جو نصوص و آثار پر ممکن حد تک وقف کرتے تھے اور ان سے کسی صورت انحراف نہ کرتے تھے اور رائے و قیاس کی طرف انتہائی ضرورت کے وقت ہی متوجہ ہوتے تھے۔ یہ طبقہ اہل حجاز کے علماء کا تھا۔ ان کے سربراہ سعید بن مسیب α تھے۔ سعید بن مسیب α اور ان کے ساتھیوں کی رائے یہ تھی کہ اہل حرمین لوگوں میں سب سے زیادہ حدیث و فقہ کو جاننے والے تھے۔ پس اہل حرمین کے پاس جو آثار تھے، وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے ان کو یاد کیا۔ پس انہوں نے حضرت اَبو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان ψ کے فتاوی اور ان کے احکام کو جمع کیا۔ انہوں نے حضرت عائشہ، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت، حضرت اَبوہریرۃ اور حضرت علی ψ کے خلافت سے پہلے کے فتاوی کو بھی جمع کیا۔ انہوں نے مدینہ کے قاضیوں کے فیصلے جمع بھی کیے اور ان میں سے اکثر کو یاد بھی کیا۔ اور ان کی رائے یہ تھی کہ اس سب کچھ کے بعد وہ رائے کے استعمال سے مستغنی تھے۔[13]

جبکہ دوسری طرف اہل الرائے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ دوسری طرف ایک اور گروہ تھا... اور یہ اہل عراق تھے، جن کے رہنما ابراہیم نخعی تھے۔ فقہاء کے اس گروہ کی رائے یہ تھی کہ شرعی احکام معقول المعنی اور ایسی مصالح پر مشتمل ہوتے ہیں جو بندوں کی طرف لوٹتی ہیں اور ان احکام کی بنیاد محکم اصولوں اور منضبط علل پر رکھی گئی ہے۔ پس یہ علماء ان علل کو تلاش کرتے تھے اور ان حکمتوں کا کھوج لگاتے تھے جن کے لیے یہ احکامات دیے گئے ہیں۔ یہ علماء ان علل و حِکَم کے ساتھ حکم شرعی کے وجود و عدم وجود کو مربوط کرتے تھے۔ بعض اوقات یہ علماء ان احادیث کا بھی رد کر دیتے تھے جو ان علل کے خلاف ہوتی تھیں، خاص طور پر جبکہ وہ احادیث ان علل و حِکَم کے مخالف بھی ہوں جبکہ اہل الحدیث علل کی تلاش کی بجائے نصوص (احادیث و آثار) کو تلاش کرتے تھے لا یہ کہ کسی مسئلے میں بالکل ہی کوئی نص موجود نہ ہو۔[14]

وقت کے ساتھ ساتھ اہل الحدیث اور اہل الرائے کا یہ اختلاف بڑھتا ہی گیا اور اس نے مناظرانہ و مجادلانہ صورت اختیار کر لی۔ اہل الحدیث، حجاز کے علاقے میں چھائے ہوئے تھے جبکہ اہل الرائے کو عراق میں علمی غلبہ حاصل تھا۔ ڈاکٹر تاج عروسی لکھتے ہیں کہ اہل عراق میں علم فقہ کی امامت کے حوالے سے اہل مدینہ سے مقابلہ کی فضا پیدا ہو گئی اور اہل کوفہ و اہل مدینہ کے مابین مناظرے شروع ہو گئے۔ یہ صورت حال بنو اُمیہ کے آخری ایام تک جاری رہی اور بعض اوقات تو یہ مناظرے ایک دوسرے پر الزامات تک بھی پہنچ جاتے تھے۔ اہل حجاز کی طرف سے سب سے قوی اعتراض اہل کوفہ پر یہ تھا کہ ہمارے (یعنی اہل مدینہ کے) پاس سے ایک بالشت برابر حدیث نکلتی ہے اور عراق میں جا کر وہ ایک بازو کے برابر ہو جاتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے ہم عراقیوں کی روایت اس وقت تک قبول نہ کریں گے جب تک کہ ہمارے پاس اس کی اصل موجود نہ

ہو...اسی طرح اہل حجاز نے اہل عراق پر سنت کو ترک کرنے اور رائے کے پیچھے پڑ جانے کا الزام بھی لگایا جیسا کہ اہل عراق نے اہل حجاز کو جمود اور رائے وقیاس کے عدم استعمال کا طعنہ دیا۔[15]

اہل الحدیث اور اہل الرائے کے اجتہادی مناہج کے ان اختلافات کو علامہ ابن خلدون[16]، علامہ شہرستانی[17] اور شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے۔[18]

ربیعہ بن اَبی عبد الرحمن فروخ (متوفی ۱۳۶ھ) فقہائے اہل مدینہ میں سے تھے۔ انہوں نے اہل عراق سے بھی فقہ کی تعلیم حاصل کی اور ان کے مزاج میں روایت کی نسبت، رائے کا پہلو غالب تھا۔ اسی وجہ سے اہل زمانہ میں ربیعہ رائی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا ایک واقعہ بعض مؤرخین اور محدثین نے نقل کیا ہے، جس سے اس زمانے میں اہل الحدیث اور اہل الرائے کے منہجی اختلاف کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:وَحَدَّثَنِي يَحْيَى، عَنْ مَالِكٍ، عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمَنِ، أَنَّهُ قَالَ: سَأَلْتُ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيِّبِ: كَمْ فِي إِصْبَعِ الْمَرْأَةِ؟ فَقَالَ: «عَشْرٌ مِنَ الْإِبِلِ» فَقُلْتُ: كَمْ فِي إِصْبَعَيْنِ؟ قَالَ: عِشْرُونَ مِنَ الْإِبِلِ، فَقُلْتُ: كَمْ فِي ثَلَاثٍ؟ فَقَالَ: «ثَلَاثُونَ مِنَ الْإِبِلِ» فَقُلْتُ: كَمْ فِي أَرْبَعٍ؟ قَالَ: «عِشْرُونَ مِنَ الْإِبِلِ» فَقُلْتُ: حِينَ عَظُمَ جُرْحُهَا، وَاشْتَدَّتْ مُصِيبَتُهَا، نَقَصَ عَقْلُهَا؟ فَقَالَ سَعِيدٌ: «أَعِرَاقِيٌّ أَنْتَ؟» فَقُلْتُ: بَلْ عَالِمٌ مُتَثَبِّتٌ، أَوْ جَاهِلٌ مُتَعَلِّمٌ، فَقَالَ سَعِيدٌ: «هِيَ السُّنَّةُ يَا ابْنَ أَخِي»[19]

"ہمیں یحیٰ نے مالک سے، انہوں نے ربیعہ بن اَبی عبد الرحمن سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے سعید بن مسیب α سے سوال کیا کہ عورت کی ایک انگلی میں کتنی دیت ہے تو انہوں نے کہا: دس اونٹ۔ میں نے پھر سوال کیا: دو انگلیوں میں کتنی دیت ہو گی تو انہوں نے کہا: بیس اونٹ۔ میں نے پھر سوال کیا: تین انگلیوں میں کتنی ہو گی تو انہوں نے کہا: تیس اونٹ۔ میں نے پھر سوال کیا: چار انگلیوں میں کتنی ہو گی تو انہوں نے کہا: بیس اونٹ۔ میں نے کہا: جب عورت کا زخم بڑھ گیا اور تکلیف زیادہ ہو گئی تو اس کی دیت کم ہو گئی؟ اس پر سعید بن مسیب α نے کہا: کیا تو عراقی ہے؟ تو میں نے کہا: میں یا تو ایک ایسا عالم ہوں جو تحقیق کرنا چاہتا ہے یا ایک ایسا جاہل ہوں جو علم کا طلب گار ہے۔ اس پر سعید بن مسیب نے کہا: یہ سنت ہے میرے بھتیجے!۔"

اہل الرائے کا روایت کے بالمقابل قیاس کو ترجیح دینا اس وجہ سے بھی تھا کہ کوفہ اس دور میں وضع حدیث کا مرکز تھا۔ خوارج وشیعہ کا فتنہ اسی شہر سے اٹھا تھا اور ان دونوں فرقوں نے اپنے مذاہب و افکار کی تائید میں احادیث وضع کی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ عراق کے فقہائے اہل سنت نے حدیث کے قبولیت کے ایسے سخت معیارات مقرر کیے کہ جن پر بہت کم احادیث پوری اترتی تھیں۔ اتنے سخت معیارات مقرر کرنا اس دور و حالات کی ایک مجبوری بھی تھی کیونکہ احادیث نقل تو ہو رہی تھیں لیکن ان کی تحقیق کا کام ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ لہذا صحیح، ضعیف اور موضوع روایات آپس میں خلط ملط تھیں۔ اہل حجاز چونکہ اس فن کے متخصصین تھے اور انہیں عراق جیسے حالات بھی درپیش نہ تھے لہذا انہوں نے اپنے مسلک کی بنیاد تتبع احادیث و آثار پر رکھی۔ جبکہ اہل عراق نے اپنے خارجی ماحول کے اثرات کے تحت احادیث و آثار کی قبولیت میں شدت احتیاط کو اختیار کیا اور قیاس ورائے کو اپنے مذہب کی بنیاد بنایا۔ اُستاذ محمد علی السایس لکھتے ہیں کہ عراق کو شیعہ وخوارج کے مستقر و مقام اور فتنے کے گھر کی حیثیت حاصل رہی ہے لہذا اس علاقے میں وضع حدیث اور اللہ کے رسول پر جھوٹ بہت زیادہ پھیل گیا تھا۔ پس عراق کے علمائے اہل

سنت نے حدیث کی قبولیت کے لیے ایسی شرائط مقرر کی کہ جن پر کم روایات پوری اترتی تھیں۔اس کے ساتھ جب آپ یہ بات بھی ملا لیتے ہیں کہ ان کے پاس صرف وہی احادیث تھیں جو عراق میں سکونت اختیار کرنے والے صحابہ کرامψ سے ان کو پہنچی تھیں تو آپ اس نتیجے تک خود ہی پہنچ جائیں گے کہ جو احادیث ان کے ہاں قابل اعتماد تھیں،وہ تعداد میں کم تھیں۔پس ان حالات میں رائے و قیاس کے استعمال سے ان کے لیے کوئی مفر(چھٹکارا) نہیں تھا۔[20]

دور تابعینΣ میں اجتماعی اجتہاد کی صورتیں

مذکورہ بالا اسباب کے باوجود اجتماعی اجتہاد کی فکر مکمل طور پر ختم نہ ہوئی تھی بلکہ اس کی بعض علاقائی صورتیں یا افکار کسی نہ کسی صورت میں اس دور میں نمایاں ہوتے رہے ہیں۔ایک روایت کے الفاظ ہیں:

حَدَّثَنَا أَبُو بَكْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ إِدْرِيسَ، عَنْ أَشْعَثَ، عَنِ الشَّعْبِيِّ، قَالَ: «إِذَا اخْتَلَفَ النَّاسُ فِي شَيْءٍ فَانْظُرْ كَيْفَ صَنَعَ فِيهِ عُمَرُ، فَإِنَّهُ كَانَ لَا يَصْنَعُ شَيْئًا حَتَّى يَسْأَلَ وَيُشَاوِرَ»[21]

"اَبو بکر کہتے ہیں ہمیں ابن ادریس نے اَشعث سے،انہوں نے شعبی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا:جب لوگ کسی مسئلے میں اختلاف کریں تو یہ دیکھو کہ حضرت عمرτ نے اس میں کیا کیا ہے کیونکہ حضرت عمرτ کوئی کام بھی اس وقت تک نہیں کرتے تھے جب تک کہ اس بارے میں صحابہ کرام سے مشورہ نہ کرلیتے تھے۔"

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:"وَفِيمَا أَجَازَ لِي أَبُو عَبْدِ اللهِ الْحَافِظُ رِوَايَتَهُ عَنْهُ، عَنْ أَبِي الْعَبَّاسِ، عَنِ الرَّبِيعِ، عَنِ الشَّافِعِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ الْحَسَنُ الْبَصْرِيُّ: إِنْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَغَنِيًّا عَنِ الْمُشَاوَرَةِ، وَلَكِنَّهُ أَرَادَ أَنْ يَسْتَنَّ بِذَلِكَ الْحُكَّامُ بَعْدَهُ."[22]

"اور ان میں سے کہ جن کی اَبو عبد اللہ الحافظ نے مجھے روایت کی اجازت دی ہے،ان کی وہ روایت بھی ہے کہ جو انہوں نے اَبو العباس سے، انہوں نے ربیع سے اور انہوں نے شافعی سے نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا:حضرت حسن بصری نے کہا:اگرچہ اللہ کے نبی مشورہ سے مستغنی تھے لیکن آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ اس لیے کیا تھا کہ آپ اس کو اپنے بعد آنے والے لوگوں میں شرعی احکام کو معلوم کرنے کے لیے ایک سنت کے طور پر جاری کرنا چاہتے تھے۔"

ذیل میں ہم اس دور میں اجتماعی اجتہاد کی کوششوں اور منہج کا چند تاریخی آثار کی روشنی میں ایک اجمالی جائزہ پیش کر رہے ہیں:

1) **فقہائے سبعہ کی مجلس مشاورت**

دور تابعین میں مدینہ میں سات فقہاء تھے جو فقہائے سبعہ کے نام سے معروف تھے۔ان فقہاء کی باہمی علمی مجالس بھی منعقد ہوتی تھیں۔ معروف مؤرخ ابن عساکر متوفی ۵۷۱ھ لکھتے ہیں:

"عبد الرحمن عبد الله بن المبارك قال كان فقهاء أهل المدينة الذين كانوا يصدرون عن رأيهم سبعة سعيد المسيب وسليمان بن يسار وسالم بن عبد الله والقاسم بن محمد وعروة بن الزبير وعبيد الله بن عبد الله بن عتبة وخارجة بن

زيد قال وكانوا إذا جاءتهم المسألة دخلوا فيه جميعا فنظروا فيها ولا يقضي القاضي حتى يرفع إليهم فينظرون فيها فيصدرون."[23] "أبو عبد الرحمن عبد اللہ بن مبارک نے یہ کہتے ہوئے خبر دی کہ فقہائے اہل مدینہ کہ جو اپنی فقہی آراء کا اظہار کرتے تھے، سات تھے۔ اور وہ سعید بن مسیب، سلیمان بن یسار، سالم بن عبد اللہ، قاسم بن محمد، عروہ بن زبیر، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ اور خارجہ بن زید Σ تھے۔ جب ان لوگوں کے پاس کوئی مسئلہ آتا تھا تو وہ اس میں مل جل کر غور کرتے اور کوئی بھی قاضی کسی نئے مسئلے میں اس وقت تک فیصلہ نہیں کرتا تھا جب تک کہ وہ ان کی مجلس میں اس مسئلے کو پیش نہ کر لیتا تھا۔"

2) قاضیوں کے مشاورتی فیصلے

حضرت عمر بن عبد العزیز α اپنے زمانہ خلافت میں قضاۃ کو اس بات کا پابند بناتے تھے کہ جو مسائل قرآن وسنت میں صریحاً مذکور نہ ہوں، ان کا حل علماء سے مشاورت کے ذریعے طے کریں۔ ابن خلف الوکیع α متوفی ۳۰۶ھ فرماتے ہیں:

"عَن عُمَر بْن قيس؛ قال: كتب عُمَر بْن عَبْد العزيز إِلَى عدي بْن أرطاة: أما بعد؛ فإن رأس القضاء اتباع ما في كتاب الله، ثم القضاء بسنة رسول الله، ثم حكم الأئمة الهداة، ثم استشارة ذوي الرأي والعلم، وألا تؤثر أحداً على أحد."[24]

"عمر بن قیس نے کہا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے عدی بن أرطاۃ (أمیر بصرہ) کی طرف ایک خط لکھا (جس کا مضمون کچھ اس طرح سے تھا)۔ أما بعد، بے شک! قاضیوں کو چاہیے کہ وہ دوران فیصلہ اس کی اتباع کریں جو کتاب اللہ میں ہے، (اور اگر کتاب اللہ میں نہ ہو تو) پھر سنت رسول کے مطابق فیصلہ کریں، (اور اگر اس میں بھی نہ ہو تو) ہدایت یافتہ أئمہ کے فیصلوں کو اختیار کر لیں (اور اگر ان میں بھی کسی مسئلے کا حل نہ ملے تو) صاحب رائے اہل علم سے مشورہ کریں اور ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دیں۔"

حضرت عمر بن عبد العزیز ہر علاقے کے فقہاء کی اجماعی آراء کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

"عَنْ حُمَيْدٍ، قَالَ: قلت لِعُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى: لَوْ جَمَعْتَ النَّاسَ عَلَى شَيْءٍ؟ فَقَالَ: «مَا يَسُرُّنِي أَنَّهُمْ لَمْ يَخْتَلِفُوا» قَالَ: ثُمَّ كَتَبَ إِلَى الْآفَاقِ وَإِلَى الْأَمْصَارِ: لِيَقْضِ كُلُّ قَوْمٍ، بِمَا اجْتَمَعَ عَلَيْهِ فُقَهَاؤُهُمْ."[25]

"حمید نے کہا ہے کہ میں نے عمر بن عبد العزیز سے کہا کہ کاش آپ تمام لوگوں کو ایک ہی فقہ پر جمع کر دیں تو انہوں نے کہا: مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ لوگ بالکل اختلاف ہی نہ کریں۔ راوی کہتے ہیں: پھر حضرت عمر بن عبد العزیز نے تمام اطراف وجوانب اور شہروں میں ایک خط بھیجا کہ ہر علاقے کے لوگ اس کے مطابق فیصلہ کریں کہ جس پر ان کے فقہاء کا اتفاق ہو۔"

شیخ حسین سلیم أسد نے اس روایت کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔[26]

3) فقہاء کی بذریعہ خط وکتابت مشاورت

اس دور میں فقہائے کرام کے مابین خط وکتابت بھی ہوتی تھی، جس سے ایک فقیہ کو دوسرے علماء کی فقہی آراء اور ان کے دلائل کو جاننے کا موقع ملتا تھا۔ ایسی باہمی مشاورت بھی بعض اوقات کسی مسئلے میں دو یا دو سے زائد فقہاء کی اجماعی رائے کا سبب بن جاتی تھی۔ امام بیہقی فرماتے ہیں: "عَنْ عِيسَى بْنِ الْحَارِثِ، قَالَ: كَانَتْ أُمُّ وَلَدٍ لِأَخِي شُرَيْحِ بْنِ الْحَارِثِ وَلَدَتْ لَهُ جَارِيَةً، فَزُوِّجَتْ، فَوَلَدَتْ غُلَامًا، ثُمَّ تُوُفِّيَتْ أُمُّ

الْوَلَدِ، قَالَ: فَاخْتَصَمَ فِي مِيرَاثِهَا شُرَيْحُ بْنُ الْحَارِثِ وَابْنُ ابْنَتِهَا إِلَى شُرَيْحٍ فَجَعَلَ شُرَيْحُ بْنُ الْحَارِثِ يَقُولُ لِشُرَيْحٍ: إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ مِيرَاثٌ فِي كِتَابِ اللهِ، إِنَّمَا هُوَ ابْنُ بِنْتِهَا، فَقَضَى شُرَيْحٌ بِمِيرَاثِهَا لِابْنِ بِنْتِهَا، وَقَالَ: {وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَى بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللهِ} [الأحزاب: 6] فَرَكِبَ مَيْسَرَةُ بْنُ يَزِيدَ إِلَى ابْنِ الزُّبَيْرِ فَأَخْبَرَهُ الَّذِي كَانَ مِنْ شُرَيْحٍ، فَكَتَبَ ابْنُ الزُّبَيْرِ إِلَى شُرَيْحٍ: أَنَّ مَيْسَرَةَ بْنَ يَزِيدَ ذَكَرَ لِي كَذَا وَكَذَا، وَأَنَّكَ قُلْتَ عِنْدَ ذَلِكَ: {وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَى بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللهِ} [الأحزاب: 6]، إِنَّمَا كَانَتْ تِلْكَ الْآيَةُ فِي شَأْنِ الْعَصَبَةِ، كَانَ الرَّجُلُ يُعَاقِدُ الرَّجُلَ فَيَقُولُ: تَرِثُنِي وَأَرِثُكَ، فَلَمَّا نَزَلَتْ تُرِكَ ذَلِكَ، قَالَ: فَجَاءَ مَيْسَرَةُ بْنُ يَزِيدَ بِالْكِتَابِ إِلَى شُرَيْحٍ فَلَمَّا قَرَأَهُ أَبَى أَنْ يَرُدَّ قَضَاءَهُ، وَقَالَ: إِنَّمَا أَعْتَقَهَا حِيتَانُ بَطْنِهَا."[27]

"عیسی بن حارث نے کہا کہ میرے بھائی شریح بن حارث کی ایک اُم ولد (وہ لونڈی جس سے اس کے مالک کی کوئی اولاد ہو) تھی جس کے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ پس اس لڑکی کی شادی ہوئی اور اس کے ہاں بھی ایک لڑکا پیدا ہوا۔ پھر وہ اُم الولد (لونڈی) فوت ہوگئی۔ راوی کہتے ہیں اس اُم الولد کی میراث میں شریح بن حارث اور اس لونڈی کے نواسے میں جھگڑا ہوا تو وہ اپنا مقدمہ قاضی شریح کے پاس لے کر آئے۔ پس شریح بن حارث، قاضی شریح سے کہنے لگے: اس لڑکے کے لیے کتاب اللہ میں کوئی حصہ نہیں ہے یہ تو اس کا نواسہ ہے۔ پس قاضی شریح نے (دونوں کی بات سن کر) نواسے کے حق میں میراث کا فیصلہ دے دیا۔ اور یہ آیت بطور دلیل پیش کی: اور رحمی رشتہ داروں میں سے بعض اللہ کی کتاب میں (وراثت کے اعتبار سے) بعض کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ پس میسرۃ بن یزید اس فیصلے کے بعد حضرت عبد اللہ بن زبیر τ کے پاس آئے اور انہیں قاضی شریح کے فیصلے کی خبر دی۔ پس حضرت عبد اللہ بن زبیر τ نے قاضی شریح α کو ایک خط لکھا کہ جس میں انہوں نے کہا کہ میسرۃ بن یزید نے مجھے اس طرح بیان کیا ہے اور آپ نے اپنے فیصلے کے وقت اس آیت "اور رحمی رشتہ داروں میں سے بعض اللہ کی کتاب میں (وراثت کے اعتبار سے) بعض کے زیادہ قریب ہوتے ہیں" کو بطور دلیل بیان کیا ہے جبکہ یہ آیت مبارکہ تو عصبات (میت کے باپ کی طرف سے رشتہ دار) کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ایک آدمی دوسرے آدمی سے یہ معاہدہ لیتا تھا کہ تو مجھے اپنا وارث بنائے گا۔ پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے یہ کام چھوڑ دیا۔ روای کہتے ہیں کہ میسرۃ بن یزید وہ خط لے کر قاضی شریح کے پاس آئے۔ قاضی شریح نے وہ خط پڑھا لیکن اپنا فیصلہ واپس لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا: اس عورت کو اس کے پیٹ کی مچھلیوں (یعنی حمل) نے آزاد کر دیا تھا۔"

4) فقہاء کے باہمی مباحث

فقہاء کے مابین مفید علمی مباحث و مکالمے بھی اس دور کے علمی حلقوں میں ایک لازمی عنصر کے طور پر شامل رہے ہیں۔ یہ مباحث بھی بعض اوقات کسی مسئلے میں ایک اجتماعی رائے کی بنیاد بن جاتے تھے۔ امام ذہبی لکھتے ہیں: "كان أبو سلمة يتفقه ويناظر بن عباس ويراجعه."[28] "ابو سلمہ حضرت ابن عباس سے فقہ کی سوجھ بوجھ بھی حاصل کرتے تھے اور ان سے مناظرہ بھی کرتے تھے اور ان سے بحث بھی لگاتے تھے۔"

ان دونوں حضرات کے ایک واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا مفتی محمد زاہد صاحب لکھتے ہیں: "ایک دفعہ ایک معروف تابعی اور مدینہ

کے فقہائے سبعہ میں سے ایک اَبوسلمہ بن عبد الرحمن اور حضرت ابن عباس کا اس عورت کی عدت کے بارے میں اختلاف ہو گیا جو حاملہ تھی اور اس حالت میں اس کے خاوند کا انتقال ہو گیا تھا۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ اس کی عدت **"اَبعد الاَجلین"** (دو مدتوں میں سے جو زیادہ طویل ہو) ہے یعنی چار مہینے دس دن کی مدت اور وضع حمل میں سے جو چیز بعد میں ہو، اس پر اس کی عدت مکمل ہو گی۔ اَبوسلمہ کہتے ہیں کہ جب بھی بچے کی ولادت ہو جائے، اس کی عدت پوری ہو جائے گی۔ دونوں اپنی اپنی دلیل بھی پیش کر رہے تھے۔ اتنے میں حضرت اَبوہریرہ τ آ گئے۔ انہوں نے کہا: میری رائے بھی اَبوسلمہ والی ہے۔ آخر کار طے ہوا کہ حضرت اَم سلمہ سے پوچھا جائے، شاید ان کے پاس اس مسئلے میں کوئی حدیث ہو۔ اَم سلمہ نے سبیعہ اَسلمیہ کا واقعہ سنایا کہ ان کے خاوند کے انتقال سے چند روز بعد ہی ان کے ہاں بچے کی ولادت ہو گئی تھی اور حضور اقدس نے انہیں دوسری جگہ نکاح کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اَم سلمہ کی اس حدیث سے اَبوسلمہ α والی رائے کی تائید ہو گئی اور ابن عباس τ کو رجوع کرنا پڑا۔"[29]

امام مالک نے ایک روایت میں اس واقعے کو نقل کیا ہے۔[30] اسی طرح حضرت سعید بن مسیب α اور ربیعہ رائی α کے مابین ایک دلچسپ مناظرے کا تذکرہ بھی ہمیں کتابوں میں ملتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

وَحَدَّثَنِي يَحْيَى، عَنْ مَالِكٍ، عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمَنِ، أَنَّهُ قَالَ: سَأَلْتُ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيِّبِ: كَمْ فِي إِصْبَعِ الْمَرْأَةِ؟ فَقَالَ: «عَشْرٌ مِنَ الْإِبِلِ» فَقُلْتُ: كَمْ فِي إِصْبَعَيْنِ؟ قَالَ: عِشْرُونَ مِنَ الْإِبِلِ، فَقُلْتُ: كَمْ فِي ثَلَاثٍ؟ فَقَالَ: «ثَلَاثُونَ مِنَ الْإِبِلِ» فَقُلْتُ: كَمْ فِي أَرْبَعٍ؟ قَالَ: «عِشْرُونَ مِنَ الْإِبِلِ» فَقُلْتُ: حِينَ عَظُمَ جُرْحُهَا، وَاشْتَدَّتْ مُصِيبَتُهَا، نَقَصَ عَقْلُهَا؟ فَقَالَ سَعِيدٌ: «أَعِرَاقِيٌّ أَنْتَ؟» فَقُلْتُ: بَلْ عَالِمٌ مُتَثَبِّتٌ، أَوْ جَاهِلٌ مُتَعَلِّمٌ، فَقَالَ سَعِيدٌ: «هِيَ السُّنَّةُ يَا ابْنَ أَخِي»[31]

"ہمیں یحیٰ نے مالک سے، انہوں نے ربیعہ بن اَبی عبد الرحمن سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے سعید بن مسیب سے سوال کیا کہ عورت کی ایک انگلی میں کتنی دیت ہے تو انہوں نے کہا: دس اونٹ۔ میں نے پھر سوال کیا: دو انگلیوں میں کتنی دیت ہو گی تو انہوں نے کہا: بیس اونٹ۔ میں نے پھر سوال کیا: تین انگلیوں میں کتنی ہو گی تو انہوں نے کہا: تیس اونٹ۔ میں نے پھر سوال کیا: چار انگلیوں میں کتنی ہو گی تو انہوں نے کہا: بیس اونٹ۔ میں نے کہا: جب عورت کا زخم بڑھ گیا اور تکلیف زیادہ ہو گئی تو اس کی دیت کم ہو گئی؟ اس پر سعید بن مسیب نے کہا: کیا تو عراقی ہے؟ تو میں نے کہا: میں یا تو ایک ایسا عالم ہوں جو تحقیق کرنا چاہتا ہے یا ایک ایسا جاہل ہوں جو علم کا طلب گار ہے۔ اس پر سعید بن مسیب نے کہا: یہ سنت ہے میرے بھتیجے!۔"

خلاصہ کلام:

حضرات شیخین کے دور تک تو اجتماعی و مشاورتی اجتہاد کا ادارہ خوب نشوونما پاتا رہا لیکن حضرت عثمان اور حضرت علی کے دور میں سیاسی و فکری اختلافات اور باہمی جنگ و جدال کی وجہ سے مسلمانوں کی اجتماعیت منتشر ہو گئی، جس کے اثرات اسلامی ریاست کے ہر قسم کے ذیلی اداروں پر بھی پڑے۔ پس اجتماعی اجتہاد کا وہ ادارہ جو حضرت عمر کے زمانے میں ہمیں اپنے نقطہ عروج پر نظر آتا ہے، حضرت عثمان کے دور خلافت کے آخری حصہ میں رُوبہ زوال ہونا شروع ہو گیا تھا۔ تابعین عظام کے دور تک باہمی جنگ و جدال تو بہت حد تک کنڑول میں آ گیا تھا لیکن فکری و

سیاسی اختلافات کی بنیادیں بہت گہری ہو چکی تھیں لہذا کئی ایک نئے فرقوں کا ظہور ہو چکا تھا۔ اس دور میں اجتماعی اجتہاد کی فکر و منہج کو کئی ایک وجوہات سے نقصان پہنچا کہ جن میں سے اُصحاب علم و فضل کا متفرق اسلامی شہروں میں پھیل جانا، بدعتی فرقوں کی طرف سے اجماع کی اہمیت کا انکار کر دینا اور اہل الحدیث اور اہل الرائے کے مابین فقہی اختلافات کا ظہور اہم ہیں۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود اجتماعی اجتہاد کی فکر مکمل طور پر ختم نہ ہوئی تھی بلکہ اس کی بعض علاقائی صورتیں یا افکار کسی نہ کسی صورت میں اس دور میں نمایاں ہوتے رہے ہیں مثلاً فقہاء سبعہ کی مجلس مشاورت، قاضیوں کے مشاورتی فیصلے، فقہاء کے باہمی مباحثے اور فقہاء کی بذریعہ خط و کتابت مشاورت وغیرہ۔

حوالہ جات

---

[1] تاج عبد الرحمن عروسي، الدكتور، الفقه الإسلامي في ميزان التاريخ، انسٹنٹ پرنٹ سسٹم، اسلام آباد، 2003ء، ص114113

[2] الفقه الإسلامي في ميزان التاريخ: ص115114

[3] أيضاً: ص116115

[4] أيضاً: ص116

[5] أيضاً

[6] محمد على السايس، الأستاذ، تاريخ الفقه الإسلامي، مطبع محمد على صبيح، مصر، ص72

[7] أيضاً: ص6766

[8] الفقه الإسلامي في ميزان التاريخ: ص125

[9] تاريخ الفقه الإسلامي: ص65

[10] الفقه الإسلامي في ميزان التاريخ: ص109

[11] الفقه الإسلامي في ميزان التاريخ: ص108107

[12] تاريخ الفقه الإسلامي: ص72

[13] تاريخ الفقه الإسلامي: ص73

[14] تاريخ الفقه الإسلامي: ص74

[15] الفقه الإسلامي في ميزان التاريخ: ص119

[16] ابن خلدون، عبد الرحمن بن محمد بن محمد، ديوان المبتدأ والخبر في تاريخ العرب والبربر ومن عاصرهم من ذوي الشأن الأكبر، دار الفكر، بيروت 1988م، 564/1

[17] الشهرستاني، محمد بن عبد الكريم، الملل والنحل، مؤسسة الحلبي، الحلب، 1211/2

[18] الشاه ولي الله الدهلوي، حجة الله البالغة، دار الجيل، بيروت، 2005م، 254/1

[19] مالك بن أنس، موطأ الإمام مالك، كِتَابُ الْعُقُولِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي عَقْلِ الْأَصَابِعِ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، 1985م، 860/2

[20] تاريخ الفقه الإسلامي: ص74

[21] أبو بكر بن أبي شيبة، الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار، كِتَابُ الْأَدَبِ، فِي الْمَشُورَةِ مَنْ أَمَرَ بِهَا، مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولى، 1409ه، 298/5

[22] البيهقي، أبو بكر أحمد بن الحسين، السنن الكبرى، كِتَابُ النِّكَاحِ، بَابُ مَا أَمَرَهُ اللهُ تَعَالَى بِهِ مِنَ الْمَشُورَةِ، فَقَالَ: {وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ} [آل عمران: 159]، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثالثة، 2003م، 73/7

[23] ابن عساكر، علي بن الحسن، تاريخ دمشق، دار الفكر، بيروت، 1995م، 57/20

[24] ابن خلف الوقيع، أخبار القضاة، المكتبة التجارية الكبرى، مصر، 1947م، 77/1

[25] الدارمي، عبد الله بن عبد الرحمن بن الفضل، مسند الدارمي، كتاب المقدمة، بَابُ اخْتِلَافِ الْفُقَهَاءِ، دار المغني للنشر والتوزيع، المملكة العربية السعودية، 2000م، 489/1

[26] أيضاً

[27] السنن الكبرى، كِتَابُ آدَابِ الْقَاضِي، بَابُ مَنِ اجْتَهَدَ مِنَ الْحُكَّامِ ثُمَّ تَغَيَّرَ اجْتِهَادُهُ، 206/10

[28] الذهبي، محمد بن أحمد بن عثمان، تذكرة الحفاظ، دار الكتب العلمية، بيروت، 1998م، 51/1

[29] محمد طاہر منصوری، ڈاکٹر، اجتماعی اجتہاد، تصور، ارتقاء اور عملی صورتیں، ادارہ تحقیقات اسلامیہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، 2007ء، ص1716

[30] مالك بن أنس، موطأ الإمام مالك، كِتَابُ الطَّلَاقِ، بَابُ عِدَّةِ الْمُتَوَفَّى عَنْهَا زَوْجُهَا إِذَا كَانَتْ حَامِلًا، 589/2

[31] موطأ الإمام مالك، كِتَابُ الْعُقُولِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي عَقْلِ الْأَصَابِعِ، 860/2